پطرس کے مضامین

احمد شاہ بخاری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

پطرس کے مضامین

احمد شاہ بخاری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Pitras Ke Mazameen
by
Ahmad Shah Bukhari
Rs.54/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 — تعداد: 1100 — قیمت: -/54 روپئے

ISBN:978-81-7587-546-3 — سلسلۂ مطبوعات: 1452

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد۔ 110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور'' معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطّل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آیندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست مضامین

اظہار عقیدت		۵
دیباچہ		۶
پطرس بخاری	رشید احمد صدیقی	۷
ہاسٹل میں پڑھنا		۲۹
سویرے جو کل آنکھ میری کھلی		۴۸
کتے		۵۹
اردو کی آخری کتاب		۶۶
میں ایک میاں ہوں		۶۹
مرید پور کا پیر		۸۰
انجام بخیر		۹۵
سینما کا عشق		۱۰۵
میبل اور میں		۱۱۳
مرحوم کی یاد میں		۱۲۰
لاہور کا جغرافیہ		۱۴۳

اظہار عقیدت

میں اپنے استاد محترم جناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی ان سے فیضِ تلمذ حاصل ہے۔

پطرس

(احمد شاہ بخاری)

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ''ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں'' آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کر لیں۔

پطرس

(احمد شاہ بخاری)

پطرس بخاری

''کیا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور''

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آراء کس کو اپنا نمایندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو! بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمایندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات میں کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے۔ اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے ''راوی'' میں پطرس کا مضمون ''کتے'' پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا۔ ظرافت

نگاری میں پطرس کا ہمسران کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز وظرافت آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پُر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی، لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیے اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح ہنستے ہیں ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو۔ بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمے داریوں کا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز وظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز وظرافت سے کام لینے والا خود طنز وظرافت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں۔ صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح وتفنن۔ ان کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردعمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بیزاری کا اظہار کرے گا دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو ابھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فنکار کا جیسا ردعمل ہوا ہے، اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے؟ یعنی فنکار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے؟ نادانستہ طور پر یہ بحث اس منزل پر آگئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا

کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی اور توثیق ملتی ہے اور فن کی غلامی شخصیت کی ناپختگی کی دلیل ہے۔ فن تکنیکی اور میکانکی ہوتا ہے اور شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے ہمارے بیشتر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں، جن پر طنز و ظرافت کا عمل کوشش کیے بغیر بھی کارگر ہو سکتا ہے، مثلاً بیوی، نیتا، مولوی، والدین، قرض، مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری، اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے، جیسے کسی تھکے ہارے شاعر کو اس سے زیادہ تھکے ہارے شعر پر اسی طرح حاضرین داد دیتے ہیں۔ مضحک کو مضحک دکھانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں۔ یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فنکار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، عام روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں انھوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے جیسے ''صحرا کو مسکرا کے گلستان بنا دیا ہو'' بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے مرکب نہیں۔ بعض اطبا بڑے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں، بعض دوسرے معمولی امراض کے لیے بھی مرکب دوائیں مثلاً معجون، گولیاں، کشتہ جات تجویز کرتے

ہیں۔ علاج دونوں مستفید ہیں لیکن، اول الذکر زیادہ مشکل ہے۔ اس لیے زیادہ قابل تعریف ہے۔ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری کی ظرافت نگاری کی مثال داغ کی غزلوں اور مرزا شوق کی مثنویوں سے دے سکتے ہیں، جس طرح ان بے مثال فنکاروں نے ماجرائے حسن و عشق کو قضیۂ زمین برسر زمین ہی رکھا ہے۔ مرزع آخرت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح بخاری نے ظرافت کو زمینی و زمانی ہی رکھا ماورائی ولامکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں اور جلد کہہ دیتے ہیں۔ انتظار کرنے اور سوچ میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور ڈرامائی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسخر رکھنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

بعض مشاہیر کو کبھی کبھی اس شوق میں مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ بدیہہ گو، بذلہ سنج اور داستان طراز بھی سمجھے جائیں۔ اس کی آسان ترکیب یہ نکالی ہے کہ بے شمار لطیفے ازبر کر لیے جائیں جن کو موقع بہ موقع (کبھی ایسے بھونڈے طریقے

سے جیسے بعض شعرا اپنا کلام سنانے کے لیے کسی شریف آدمی کو دفعتاً گھیر لیتے ہیں) سناتے رہیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے ظرافت کا مدار ذوق پر ہے، حافظے پر نہیں۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ خود ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے۔ تجارت کے لیے نہیں، تواضع کے لیے۔ وہ اپنی تحریر میں لطیفوں اور چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے، بلکہ طباعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ خواں نہ تھے۔ لطیفہ طراز تھے۔ ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف بھی پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ایک لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی کوفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو۔

غالباً ۱۹۴۵ء میں پی ای این کا سالانہ اجلاس جے پور میں منعقد ہوا تھا۔ ای ایم فاسٹر، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، صوفیا وادیا، مرزا اسمٰعیل، ملک راج آنند، بخاری اور کتنے مشاہیر علم و ادب ہندستان اور ہندستان سے باہر کے شریک جلسہ تھے۔ موسم خوشگوار، جے پور کا تاریخی خوبصورت اور ستھرا شہر، ریاست کی روایتی مہمان نوازی، مرزا اسمٰعیل کا انتظام، جو اس زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ پی ای این کا ایسا شاندار اجلاس ہندستان میں شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد منعقد ہوا ہو۔ تین دن تک کیسی کیسی عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ بلند پایہ مقالے پڑھے گئے۔ علمی مذاکرے رہے، بے تکلف ملاقاتیں اور پُر تکلف دعوتیں ہوئیں۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجہ کرنے والی شخصیت، حسین و

ذہین خدوخال، سجل اور ستھرا لباس، بے تصنع خرام و قیام، ہر شخص سے اس کے مناسب حال گفتگو، مزے کی بھی پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں لیکن ان کا اپنا اندازہ یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یوں ہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آجاتے جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں ورنہ بیشتر عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقے میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔ مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئی۔ اردو اور ہندستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلے کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا۔ بحث تفصیل سے یاد نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلق ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہ ''ذولسانی'' کشمکش ان کے فکر و نظر کی فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اس کے حسن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف انگریزی ادب کے اصلی خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لیے جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پورے طور پر آشنا، نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے۔ اس لیے جدید ادب کے افکار پرکھنے کی صلاحیت سے بے گانہ ہیں۔ ان کا پورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صَرف ہو رہا ہے۔ بخاری کے اِن خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیت دی گئی اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ کتنے اہم موضوع پر، کتنی فکر انگیز بات، کس وضاحت سے، کتنے بڑے مبصر نے کی۔

آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا تو اس کے عملے کا تقرر ایک

بورڈ نے کیا، جس میں مسٹر فیلڈن، ڈائرکٹر جنرل، بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر لودی اور کچھ اور لوگ تھے جن میں ایک میں بھی تھا۔ صدر فیلڈن تھے۔ اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجاز مرحوم اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف آسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔ فیلڈن بڑے ذی استعداد، جری اور آزاد خیال تھے۔ ریڈیو کا کاروبار سنبھالنے ولایت سے نئے نئے آئے تھے۔ حکومت ہند کے اعلا انگریز عہدیداروں تک کی پروانہ کرتے تھے، لیکن بخاری کا کلمہ پڑھتے تھے اور ان کے اشاروں تک کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے امیدواروں سے ہر ممبر اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کر کے رائے قائم کرتا۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی۔ اس پر ان کا بھاری بھرکم جثہ، ایسی ہی آواز، کڑے تیور، امیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔ تھوڑی بہت ان امیدواروں پر بھی جو بعض امیدواروں کی موافقت پر مائل ہوتے۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد میری نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھا ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلۂ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے آ چکے تھے۔ گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا "ڈاکٹر حیدر! دیکھو اگر تم نے آیندہ امیدواروں کو ڈرانے دھمکانے کا ارادہ کیا تو بے تامل تم کو گولی ماردوں گا۔"

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پر پیچھے کی طرف لیٹ سے گئے۔ پھر مصافحہ کے لیے فیلڈن کی طرف

اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حیدر کے داد دینے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی ''صدیقی صاحب! آؤ ادھر آ بیٹھو۔ فیلڈن کے نشانے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا''۔ اب فیلڈن کا وہی حال تھا جو پروفیسر حیدر کا تھا۔

بڑے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی۔ بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے نہ مایوس، نہ متفکر، توازن اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ کبھی برجستہ فقروں سے، کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے لیکن اس دوران میں مقصد کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتے اور جہاں تہاں کچھ منوا لیتے تھے۔ کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک کارآزمودہ جنرل کی مانند، حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہو کر، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے بھی۔

یہ سماں ایک بار آل انڈیا ریڈیو دہلی میں دیکھا۔ جب بخاری اس کے ڈائرکٹر جنرل اور...... منسٹر انچارج تھے جن کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ بخاری کے عاشق زار نہ تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ آئے روز وزارت سے عتاب نامے اور ملک کے گوشے گوشے سے طرح طرح کے وفد نازل ہوتے رہتے۔ بخاری کو ان دونوں سے نپٹنا پڑتا، مگر وہ مطلق فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ وزارت کے عتاب ناموں کو تو ''نامۂ الفت'' کہا کرتے تھے اور وفود کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ان کی نفسیات وہی تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے اس مصرعے میں کیا ہے۔

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایسے وفود کا خیر مقدم وہ اس طرح کرتے جیسے اپنے بے تکلف دوستوں یا عزیز طالب علموں کو چائے پر مدعو کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک وفد باریاب ہوا۔ بخاری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ موقع کی اہمیت کا احساس کرتے اور دلاتے ہوئے ایک مختصر لیکن لاجواب انگریزی تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور تقریر کو ختم کیا۔ چند خوشنما، توصیفی فقروں پر جس کے مخاطب وہ بگڑے دل لیکن غبی اراکین تھے جن کو متعارف ہوتے وقت انھوں نے اپنی بے خطا ذہانت سے بھانپ لیا تھا۔ بخاری کی شیوا بیانی سے وفد ڈانوڈول ہو گیا اور ممبروں کے وہ کڑے اور کڑوے تیور مضمحل ہو گئے، جن کے ساتھ وہ "غالب کے پُرزے" اڑانے آئے تھے جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی اس کو ان سورماؤں نے پورا کر دیا جن پر بخاری کا جادو پہلے سے چل چکا تھا اور مباحثے کے دوران میں بخاری کی ناقابل بیان و ناقابل گرفت شہ پا کر جس کے وہ امام تھے اپنے ساتھیوں ہی سے بدکنے اور رد و قدح کرنے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر بخاری نے پینترا بدل دیا اور ہمہ تن ان ممبروں کی تکریم و تواضع پر مائل ہو گئے جو یقیناً قابلِ لحاظ تھے، لیکن اب تک ان کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ ان سے ملنے اور بات کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ بڑے عالمانہ اور ماہرانہ سطح سے گفتگو شروع کی اور بندی کے مسئلے پر جتنی کتابی، اخباری، دفتری معلومات اور طرح طرح کے شمار و اعداد ان سے اخذ ہوئے نتائج بخاری کے حافظے میں اور زبان پر تھے جن کے نصف مواد تک بھی وفد کے ممبروں کی رسائی نہ تھی۔ پھر ان کا سریع الانتقال، کرشمہ کار اور ناقابل تسخیر ذہن اور بات منوانے کے طرح طرح کے انداز۔ بخاری کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ اجلاس میں ہر

طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر آنے میں بخاری کے ہمسر کچھ ہی لوگ دیکھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اراکین بھی "زیرِدام" آگئے اور بخاری نے "اعلا قدر مراتب" کسی سے ہاتھ ملا کر کسی کو گلے لگا کر، کسی کی شان میں دو چار نہایت مبالغہ آمیز فقرے کہہ کر جو اتنے ہی مغالطہ انگیز بھی ہوتے وفد کو ہنسی خوشی رخصت کر دیا۔ اعلا قدر مراتب کا ان کا اصول اور دوسرے کا المیہ یہ تھا کہ جس کو جتنا تہی مغز سمجھتے اتنا ہی زیادہ اس سے "سوگن التفات" ہوتے۔ اس سے حساب لگایا جا سکتا ہے کہ جس سے انھوں نے معانقہ کیا ہوگا اس کا ان کے ہاں کیا درجہ رہا ہوگا۔

اس حربے سے بخاری ہی کام لے سکتے تھے۔ ان سے ذرا بھی کم درجے کا آدمی اس حربے کا خود شکار ہو جائے گا۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس طرح کے تیر تھے موقع آ جانے پر انتخاب جس تیزی اور تیقن سے کرتے اور جس مشاقی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ڈائرکٹر جنرل شپ کے زمانے میں ایک ہندستانی ڈکشنری کی تالیف میں مصروف ہو گئے تھے، جس میں ملک کے بعض مخلص اور مستند اہل قلم ان کے شریک کار تھے۔ یہ کام ان ہی کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ اس میں ان انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ہندستانی مترادفات دیے گئے تھے جو ریڈیو اور اخبارات وغیرہ میں رائج تھے۔ یہ کام اس زمانے میں جتنا ضروری تھا، اتنا ہی نازک اور مشکل تھا۔ اس لیے "ہندستانی" کا لفظ یا تصور (جسے ہندی اردو کا سنگم کہتے تھے) اردو اور ہندی دونوں کے

علمبرداروں کے یہاں نامقبول تھا۔ لغت کی کئی ضخیم جلدیں تھیں جو ٹائپ میں چھاپ دی گئی تھیں اور نظر ثانی کے لیے مختلف اصحاب کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ تمام مترادفات اس ترتیب اور وضاحت سے علاحدہ علاحدہ خانوں میں دی گئی تھیں کہ متلاشی کو انتخاب میں وقت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد معلوم نہیں اس لغت کا کیا حشر ہوا۔ مکمل ہو جاتی تو ہندستان اور پاکستان دونوں کے محکمہ نشر و اشاعت کے لیے بہت کارآمد اور بھلے مانسوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت مفید ہوتی۔

انگریزی شعروادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا ہم سب جانتے ہیں لیکن ان کے ذوق و ذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے اردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار، گوارا، ٹھہری ہوئی اور خوش آیندہ فضا محسوس کرتے ہیں جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسل سے انگریزی کی جھلک اردو میں دیکھ کر اردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں کہ غیر زبان کا اردو میں ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ غیر زبان کی جینیس کا پتا نہ لگے۔

انگریزی موضوعات، مفاہیم اور اسالیب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام اوروں نے بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے ایسا کرنے میں اکثر ترجمے، تفسیر یا مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ادھ کچرے طور سے یا انگریزی کے مطالب کو اردو کے روایتی شاعرانہ الفاظ یا انداز میں اس درجہ شرابور کر کے پیش کریں گے کہ نہ انگریزی ذہن کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا نہ انگریزی زبان کا، نہ انگریزی اسالیب کا اور نہ

انگریزی فضا کا۔ بخاری کی اردو کو میں ٹکسالی نہیں کہتا لیکن انگریزی کے پرتو سے
ان کی اردو اس طرح جگمگاتی ہے جیسے

پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

الہامی اور قانونی کتابوں کا ترجمہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ اس کے
بعد میرے نزدیک یوروپین زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ مشکل ہے، جہاں فن،
بیان و زبان اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی نازک اور ناقابل گرفت وارداتوں کا
سامنا ہوتا ہے جس طرح سیسمو گراف (زلزلہ پیما) زمین کے چھوٹے بڑے
ارتعاش مرتسم کرلیتا ہے اسی طرح اچھا ڈراما سوسائٹی اور زندگی کے ارتعاشات کی
نشان دہی کرتا ہے۔ بخاری نے انگریزی کے بعض مشہور ڈراموں کا جس خوبی
سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی
سوسائٹی کے مزاج اور ڈرامے کی فنی نزاکتوں سے پورے طور پر واقف ہونے
کے علاوہ اردو کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرانے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت
رکھتے تھے۔ اردو کا کوئی معمولی واقف کار اس غیر معمولی فریضے سے عہدہ برآ نہیں
ہوسکتا تھا۔ ان کی ظرافت نگاری اور انگریزی ڈراموں کے تراجم دیکھ کر ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بخاری نے اردو کی ایک نئی جینیس اور ایک نئی توانائی کا
انکشاف کیا ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے بخاری نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن
اردو کے ادبی تنقید نگاروں میں ان کا پایہ مسلم ہے اور یہ اس حقیقت کا مزید ثبوت
ہے کہ بخاری نے بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے، لیکن بہتوں سے اونچا مقام پایا
ہے۔ گزشتہ ۲۰۔۲۵ سال میں اردو تنقید پر کافی توجہ دی گئی اور اب تو ادبی

مذاکروں یا مجادلوں میں اس کا نام سرفہرست آتا ہے۔ غزل کے بعد تنقید کے فن شریف پر ہمارے قبیلۂ شعر و ادب نے سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے تنقید کے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوں اور تنقید نہیں تبلیغ کرتے ہوں۔

اردو میں جدید تنقید کا بیشتر سرمایہ مغربی ہے لیکن اسے جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اس میں مغربی تنقید کی اتنی توضیح نہیں ملتی جتنا اس کا ترجمہ۔ ہمارے بعض تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی کہ مغربی تنقید کے کس اصول سے اردو کے کس صنفِ ادب کو پرکھیں۔ نیز مغرب میں جن اصناف ادب پر تنقید ملتی ہے، ادب کی وہ صنفیں اردو میں ہیں بھی یا نہیں یا اردو میں جو صنف ادب ملتی ہے اس کے لیے مغرب نے کوئی اصول تنقید وضع بھی کیا ہے یا نہیں؟ ادب کہیں کا ہو، کسی طرح کا ہو، تنقید مغربی ہو گی کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔

یہ بحث فرسودہ بھی ہے، تلخ بھی، شاید بے نتیجہ بھی۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بخاری اس حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تنقید وسیع ترین مفہوم میں خالص ادبی ہوتی تھیں۔ انھوں نے جس مسئلہ پر یا شخص پر لکھا ہے اس کو اپنے نقطہ نظر کے تابع نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ نقطۂ نظر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مسئلہ یا شخص میں خوابیدہ یا بیدار موجود ہے۔ ادبی پارکھ کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی ادبی تخلیق یا شخصیت پر قلم اٹھائے تو اس کا احاطہ اس طور پر کرے کہ جز و اور کل دونوں گرفت میں آجائیں۔ نہ یہ جز و سے کل کی نشان دہی کرے اور کبھی کل سے جز و

کو روشناس کرائے۔ تصوف میں یہ روا ہے تنقید میں نہیں۔ ایسی تنقید یا پرکھ کے لیے ادب کی وسیع معلومات اور تنقید کے فنی اصول سے گہری واقفیت کے علاوہ ایک بڑی شرط یہ ہے کہ تنقید نگار کی نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی ہو۔

بخاری کی تنقید کا بڑا اچھا نمونہ ان کا مضمون ''کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں'' ہے۔ عصمت چغتائی کی تحریریں منظر عام پر آئیں تو ادبی اور غیر ادبی دونوں حلقوں میں ''ایک شور طوفان خیز'' اٹھا اور ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں سخت اختلاف آرا ہوا۔ یہ اختلاف شدت پر تھا کہ بخاری کا یہ مضمون شائع ہوا۔ بخاری نے ایسا بے لاگ تجزیہ اتنی گہرائی بصیرت کے ساتھ اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ موافق اور مخالف دونوں مدہم پڑ گئے البتہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود عصمت چغتائی کے نقطۂ نظر پر اس کا کیا اثر پڑا۔

بخاری مزاج کا مغربی نہ تھا۔ ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیشتر ساتھیوں میں اردو شعر و ادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کے اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے ان کا اور ان کے رفقاء کا اردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے میں نیازمندان لاہور کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظر انداز کرنا آسان ہوتا۔ نیازمندوں کے جرمے میں بخاری کا انداز بے تکلف پہچانا جا سکتا تھا۔ اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار، نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ اعلا پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک

مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسید اوران کے رفقائے علی گڑھ میں، تو اردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

یہ خیال اس لیے ذہن میں آیا کہ تقسیم ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آگئے تو اردو کو نئے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور قومی عزائم کے مطابق اس کی تنظیم و ترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقاء یونیورسٹی میں اردو کا اعلا تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ کتنی حوصلہ انگیز دوررس اور گراں قدر یہ اسکیم تھی جو بروئے کار آجاتی تو کیا عجب آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے بیرون ملک کھینچا اور ساتھیوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ دکھاتا اور ساتھی نوجوانوں کی قیادت کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے اکابر موجود ہوں، علمی، قومی اور تہذیبی کارناموں کی روایت کی فراوانی ہو اور قوم و ملک کی نئی تشکیل و تنظیم کے لیے دعوت کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو وہاں یہ بے عملی و۔بے حوصلگی کیسی۔ اس اجتماع کے فرد نے اپنے اپنے طور پر جا ہے جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو اس سے انکار نہیں لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک المیہ نہیں تو مسئلہ فکر یہ ضرور ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پر اہل فضل وکمال کا جیسا نادر روزگار اجتماع دہلی میں ہوگیا تھا۔ اس کی مثال مسلمانوں کے عہد کے ہندستان میں کہیں اور کم نظر آئے گی جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا۔

تھے ہنرمند اتنے تجھ میں جتنے گردوں پر نجوم

غدر میں یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ان میں سے سرسید نے اپنے رفقاء کرام کے ساتھ علی گڑھ میں ایک جدید شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مسلمانوں کی حیات نو کی طرح ڈالی۔

اس کے بعد اور پہلی جنگِ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں علوم و فنون کے کتنے اور کیسے کیسے جامع کمالات ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں، جن میں 'جوانانِ سعادت مند'' کے پیر دانا سر شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان اور ڈاکٹر سر اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر یقیناً ان لوگوں میں تھے جو پنجاب کے سرسید ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی بزرگی، شفقت اور سرپرستی کا تعلق ہے انھوں نے لاہور کے ہونہار نوجوانوں کے لیے کم سے کم اتنا ضرور کیا جو وہاں کے کسی اور سے نہ ہو سکا۔

شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ اس کی توقع بخاری سے تھی۔ وہی ان مرکز گریز اعلا صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع کر سکتے تھے۔ ایک حد تک انھوں نے رکھا بھی لیکن یہ شخصیتی تعلقات کی بنا پر تھا کسی عظیم مقصد یا منظم اسکیم کے ماتحت جیسا کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی۔ اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کچے احباب ہونہار

نوجوانوں کو اپنے سایہ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نئے صحت مند علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا غیر متقین، بڑا خطرناک لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہوتا ہے۔ پاکستان کے نوجوان کو مناسب اور بروقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا۔ کسی اور سے ناتہ جوڑ لے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ نوجوان کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ دراصل وہ اپنے شباب کی وارداتوں میں (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے دیتے ہیں۔

اسی حلقے (''نیاز مندان لاہور'' یا ناموران لاہور'') سے اس زمانے میں ایک بحث یہ اٹھائی گئی کہ پنجاب میں جو یہ ''میں نے جانا ہے'' یا اس طرح کے اور فقرے بولے جاتے ہیں ان کو غلط کیوں قرار دیا جائے۔ پنجاب کے لوگ اردو سے کچھ کم واقف نہیں ہیں۔ اردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ نثر اور نظم کی محفل میں ان کا درجہ کسی سے کم تر نہیں رہا اردو کا مستقبل بھی پنجاب ہی میں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ فارسی عربی کے علاوہ مغرب کی زبانوں اور خزانوں سے بھی انھوں نے دوسروں کی طرح استفادہ کیا ہے وغیرہ۔ اس لیے ان کی زبان پر یہ فقرہ جس شکل میں آتا ہے اس کو صحیح کیوں نہ مانا جائے۔

کچھ دنوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا لیکن جلد ہی ختم ہوگیا اور بات جیسے آئی گئی ہوگئی۔ اس موضوع پر ان سے اکثر گفتگو آئی۔ اتنی علمی و ادبی نہیں جتنی تفریحی۔ یوپی کی زبان، اشخاص یا شاعروں پر بخاری کو طبع آزمائی کا شوق ہوتا تو

بے تکلف روئے سخن میری طرف کر دیتے۔ ایک بار بڑے مزے سے اور بہت زور دے کر کہنے لگے "پنجاب اس طرح کے فقرے اسی طرح بولے گا آپ کے (نام حذف کرتا ہوں) جو چاہیں کر لیں۔ یہ جملہ غلط کیوں ہو۔" میں نے کہا "ہاں کیوں ہو۔" کچھ مسکرائے کچھ نرم پڑے۔ لیکن انداز کی برہمی رکھتے ہوئے بولے "بتایئے نا! آپ صرف ونحو میں خاصے مبتلا رہتے ہوں گے۔ اس میں قباحت کیا ہے؟" میں نے کہا "صرف ونحو سے قطعاً معصوم ہوں۔ آپ بھی ہوں تو ایسا کوئی سانحہ نہ ہوگا لیکن چھوڑیئے۔ ان باتوں کو۔ میں تو چاہوں گا کہ یہ فقرے اسی طرح بولے جائیں۔ اس میں ہزار عیب ہوں ایک خوبی بے مثل ہے۔ بولے "یعنی یہ؟" عرض کیا، اس سے آدمی پہچان لیا جاتا ہے۔" بے اختیار قہقہہ لگا کر کھڑے ہو گئے بولے صدیقی صاحب! میرے ساتھ چلیے۔ میں اس فقرے پر آپ کے اعزاز میں، کھڑے کھڑے، پنجاب میں فرسٹ کلاس بلوا کرا سکتا ہوں۔

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے اوپر اعتماد ہو۔ محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لیے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف، یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ Safety First یا Self First بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے" آمیزشے کجا گہر پاک او کجا کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے زیادہ دل کش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

بخاری کو اچھے سوٹ پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک زمانے میں جب آل انڈیا ریڈیو کا پہلا دفتر علی پور روڈ پر تھا اور وہ اسٹیشن ڈائریکٹر یا اس سے اونچے کسی منصب پر تھے۔ ان کا درزی کشمیری دروازے کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ دکان اور مرجوعہ دیکھتے ہوئے کچھ ایسا ماہر فن نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن بخاری اس کے فریفتہ تھے۔ اس کے پاس کبھی تقاضے کے لیے، کبھی سوٹ میں ترمیم واصلاح کی غرض سے اس پابندی اور شغف سے آتے تھے جیسے بعض مصنفین اپنی کتاب کا مسودہ دیکھنے بھالنے کاتب کے گھر یا پریس کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس مہم پر ایک بار میں بھی ساتھ تھا۔ دکان پر پہنچے تو وعدہ خلافی پر درزی سے کچھ دیر مصروف واسوخت خوانی رہے۔ کپڑے کی قطع برید، استر، سلائی، کاج بٹن کے بارے میں ایسے نکتے درزی کے ذہن نشین کرانے لگے۔ ضمناً میرے بھی کہ حیران رہ گیا کہ اچھا خاصا آدمی کس چکر میں مبتلا ہے۔ شاید اس بات کو سمجھ گئے۔ دفعتاً بولے "کیوں صدیقی صاحب! آپ کو سوٹ سے بھی دلچسپی ہے؟" عرض کیا "کیوں نہیں، لیکن مردوں کے نہیں عورتوں کے سوٹ سے۔"

بخاری ہنس پڑے لیکن فقرے کی داد درزی سے دلوائی یہ کہہ کر کہ

صاحب کو سلام کرو۔ صاحب عورتوں کا سوٹ پسند کرتے ہیں۔ سلام تو اس نے کیا لیکن جیسے اسے اس کا یقین نہ کہ اس پسند کا اظہار میں نے سوٹ میں ملبوس کسی خاتون سے کرنے کی کبھی جرأت کی ہوگی۔ مدتوں بعد، تقسیم ملک سے پہلے مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بنی تو ایک دفعہ دفتر میں ملاقات ہوئی۔ سر سے پاؤں تک کسی اعلا نسل کے کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ دیکھ کر ہم دونوں بیک وقت مسکرائے لیکن ستم یہ تھا کہ بخاری کا مسکرانا میرے مسکرانے پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک بار میں نے خط لکھا کچھ روپے بھیج دیجیے، کار خیر کے لیے درکار ہیں۔ خط ملتے ہی روپے بھیج دیے تو توقع سے زائد۔ میں نے شکریہ کے خط میں لکھا بخاری صاحب! میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا۔ اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا۔ مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی ہے اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کار خیر میں بھیجی ہے وہ آپ کے اب تک کے گناہوں کے لیے ایسی ہی ثابت ہوگی۔'' بخاری نے لکھا ''مژدے کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو ''شرح مبادلہ زر'' اتنا خاطر خواہ نہ رہے۔ تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے ان کے نہ تھے۔ وہ یقیناً ان کو

بہت عزیز رکھتے تھے لیکن مقررہ خانوں میں ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہو جاتی ہو گی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔ روپے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے، تحریر و تقریر سے لیکن شاید وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت، علمیت، اقتدار اور شہرت کے میدان میں ان کا کوئی ساتھی یا کوئی اور ان کا ثانی ہو۔ بخاری بڑے بت شکن تھے۔ جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے۔ اقوام متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جانفشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے وہاں کے چھوٹے بڑے اہل کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے اور یاران باصفاء سے ملنا ہو جاتا تھا، تو جس محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں۔ کچھ عرصہ سے ان کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی ''بادشمال'' کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا۔ پی ای این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے۔ فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں۔ چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے۔ چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ''ہندستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ

جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیے یا ادب کی خدمت کرنا چاہیے کتنی غلط جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔" بات کچھ آگے بڑھی تو بولے "تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقید کر لیتے۔ موقع ملتا تو میں ان کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا" پھر دبی زبان اور غم کی مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ "وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔"

آج یہ گفتگو یوں یاد آ رہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوام متحدہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے لیکن اسے کیا کہیے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے وہ زندان حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز فرمایا ہوگا۔

رشید احمد صدیقی
علی گڑھ

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی، اے بھی پاس کر لیا، لیکن اس نصف صدی کے دوران جو کالج میں گزارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا، یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتے داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھ رہے تھے۔ دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے، جس کی نشو ونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آیندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی

کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتے داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر ومباہات کا باعث بن گیا اور ''مرکزی رشتے داروں'' نے تو اس کو پاسِ وضع اور حفظِ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت ونجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی، اس لیے بلا تکلف یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک وقوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار اور ایمان دار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کرچکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی، تصنیف وتالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جاسکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہرفن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کردیا گیا، کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے

ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گردونواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب، تحصیل دار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی، لیکن جب ادھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سنیما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوش گوار مقام ہے اور اعلا درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیل دار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا، لیکن انھوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا

شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انھوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبہ باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں یا کسی جوئے خانے میں ہزار ہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور، مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید، مگر ہاسٹل مُضر۔ وہ بہت ٹھیک، مگر یہ ناممکن۔ جب انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے، جس سے لڑکا ہاسٹل کی زَد سے محفوظ رہے تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے، چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں

کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا، وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا، چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ "ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو" جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں، ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وابستگی ہونی چاہیے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت

گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے میں سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ناممکن ہے، گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے، کون سا ملازم موافق ہے، کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشو ونما کے لیے چند گنجایشیں پیدا کرلیں لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا، والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے از حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہوجائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرایے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کرکے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن

شام کے وقت بیچارا ہاسٹل کو واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامتِ اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کے بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کے بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انھیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آ گئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا

کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو، اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبہ کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرایے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن اس نئے پیرایے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، تو ایک دن والد نے پوچھا:

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔

میں نے کہا" دیکھیے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی، لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو لیکن پھر بھی اس کی شخصیت...... نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیے، ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر ہو بھی، تو بھی...... گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے...... ٹھہریے، میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کے بجائے والد نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہیے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنالیا لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے:" کیا سیرت سے تمھارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا:" چال چلن ہی کہہ لیجیے۔"

" تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا

چاہیے؟''

میں نے کہا ''بس یہی تو میرا مطلب ہے۔''

''اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟''

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا ''جی ہاں۔''

''یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ سچ زیادہ بولتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔''

کہنے لگے: ''وہ کیوں؟''

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیمِ انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا۔

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں ''زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن'' گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹی میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے

اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے، صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا لیکن معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا روّیہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہر گز نہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی، اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔

بی، اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی، اے میں کیوں فیل ہوا، اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف، اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا اس لیے ہم اس میں ''کچھ'' پاس ہی ہو گئے۔ بہر حال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں مگر نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی، اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی، اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا

لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضا مند ہو گئے، چنانچہ بی، اے میں ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوتِ مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا، آپ یقین مانیے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لیے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا، لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا، یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کما حقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن بی، اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا، کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ سوچیے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صَرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صَرف نہ کرتا بلکہ اس کی بجائے ...... مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لیے از حد حیرت کا موجب ہوا اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی

اس پر سخت ندامت ہوئی، لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت ڈھل گئی اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی، اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا، لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید وشاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے، لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:

۱۔ انگریزی۔تاریخ۔فارسی

۲۔ انگریزی۔تاریخ

۳۔ انگریزی۔فارسی

۴۔ تاریخ۔فارسی

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیے۔اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا:

۵۔ تاریخ میں فیل

۶۔ انگریزی میں فیل

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہوگا۔لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے

بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی، اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یکلخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انھیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا لیکن ادھر ادھر کے لوگ ''اجی نہیں صاحب''، ''اجی کیا کہہ رہے ہو؟''، ''اجی یہ بھی کوئی بات ہے؟'' ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسبِ دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں

اور جب ماموں کے دڑبے سے نکلے تو شاید اپنا ایک دڑبہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبہ کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرض داشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی، کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کے بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔"

میں نے جواب دیا "ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے، باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری رہتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبہ علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادبِ انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبہ اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبہ رباعیوں میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ......'' والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آیندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا، کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل میں آرہے ہیں جس سے ہم طلبہ کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادرِ مہربان کی سی سوچ لی، جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلبہ مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو

مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

☆☆☆

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے، ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے کہ نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لحظہ لحظہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباواجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں۔

"اچھا...... اچھا!...... تھینک یو!...... جاگ گیا ہوں...... بہت اچھا! نوازش ہے۔" آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ

سوتے کو جگا رہے ہیں یا مُردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرتِ عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے تھے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے، اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں۔ سوچا کہ آج پتا چلائیں گے کہ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی:

"لالہ جی!......لالہ جی!"

جواب آیا "ہوں۔"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے" تین...... تو نہیں...... کچھ سات...... ساڑھے سات......
منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا" ارے کمبخت! خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا۔ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت ہم دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے، تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں کوئی مذاق ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیر باد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی" مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمایئے۔"

بولے "ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان۔ دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھا لیں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علاحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵/اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے

کیوں نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغو بات ہے۔ البتہ پانچ، چھے، سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوتِ ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے۔ ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ ''لالہ جی!''

انھوں نے پتھر کھینچ مارا ''یس!''

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ ''لالہ جی! صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھے بجے یعنی جس وقت چھے بجیں......''

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا ''جب چھے بج چکیں تو...... سنا آپ نے؟''

چپ

''لالہ جی''

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا ''سن لیا۔ سن لیا۔ چھے بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فورا یلفا پلس......''

ہم نے کہا "ب ب ب بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"
توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن چھے بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کردی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کردی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے، لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھے دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں

ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صَرف کیا، ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔
''لالہ جی! صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کے بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بُری طرح کٹا کرتا۔''

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے ''تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟''

میں نے کہا ''ہاں ہاں۔ واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک۔''

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علاحدہ جوڑ دیں، کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا، اوورکوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا، کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے، دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا، تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت

خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو ''گڈ مارننگ'' کیا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا۔ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا کہ ''دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔'' دل نے کہا ''اور کیا۔ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔'' ہم نے کہا ''سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ ذہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔'' ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے...... ''خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر، نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بچارہ یہی کہتا کہتا مر گیا، لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی......'' (لحاف کانوں پر سرک آیا) ''......تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں...... بہت ہی پہلے...... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے۔۔۔ کیا بات

ہے! خداوند، کالج والے بھی کس قدر سست ہیں۔ ہر ایک مستعد انسان کو چھے بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے ...... "(لحاف سر پر)" ...... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلا قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے ......" (آنکھیں بند)" ...... تو اب چھے بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟" پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے ...... لیکن شیکسپیئر ...... نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا ...... شیکسپیئر ...... ہیملٹ ...... لیکن ورڈزورتھ ...... لیڈی میکبتھ ...... دیوانگی ...... سبزازار ...... سنجر سنجر ...... باد بہاری ...... صید ہوس ...... کشمیر ...... میں آفت کا پرکالہ ہوں ......۔

یہ معمّا اب فلسفہ مابعد الطبیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے۔ کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو

آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا۔"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔ "او ہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں......اس کے بعد......کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں۔"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکایک ایک محجوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کے کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اس وقت...... اے......اے......نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و تقوی کی تسکینی میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھے بجے، جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران لالہ جی آواز دیں تو نماز!

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب" ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری کی روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی

ہوئی گا رہی ہو۔

''تم جاگو موہن پیارے''

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دلآویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت ''سانوری صورت توری من کو بھائی'' کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے ''مسٹر! مسٹر'' کی آواز اور دروازے کی دنادن سامع نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصے میں گڑویوں کے گر پڑنے، دیگچیوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلّیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

☆☆☆

کتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے، دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجیے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ "کتا وفادار جانور ہے۔" اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھے بجے تک بھونکتے چلے گئے، تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر "طرح" کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کمبخت بعض تو دوغزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا

تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے، یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے؟

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں سے ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون وکوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابلِ تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجیے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے، کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کردی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کردی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر، نہ سَر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ بس گلے بازی کیے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجیے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیا گرہ سے منہ موڑا

ہو۔شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی، چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافعِ بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔حالانکہ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجے غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بُزدل ہیں۔شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگالیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔یہ البتہ ٹھیک ہے۔ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوااور کچھ نہیں نکلتا۔اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی۔اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آرہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کررہے ہیں، چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے،تو کوئی یہی سمجھے گا انگریزی موسیقی ہے۔اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ذرا تصور ملاحظہ ہو۔آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔گویا بہت ہی کتا۔بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہوگئی لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی

مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی تھی۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینا آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کے بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرع دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں، سمجھ لیجیے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں، بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چاروناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیے) لیکن یہ کمبخت دوروزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلّے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں

لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا؟

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری)۔ اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفریں رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کیے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں۔)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بار

گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور وفکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھنکھنایا۔ لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پر جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انھوں نے غیظ وغضب کے لہجے میں آپ سے پُرسش شروع کر دی۔ "بچا فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلا قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنون انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے۔

عُرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔" یہ بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کردے اور کاٹنا شروع کردے؟

☆☆☆

اردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے:

۱۔ وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

۲۔ بڑا کب ہو گا؟ مفصل لکھو۔

۳۔ دولھا کب بنے گا اور دلھن کب بیاہ کر لائے گا؟
اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵۔ تو کب کمائے گا؟

۶۔ آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟
باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی

صورت بناتا ہے تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگورا لٹک رہا ہے۔ سلاتا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے۔ (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کبھی نیند میں رونے لگتا ہے تو بچاری ماما کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ وا!

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا، بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے، کسی میں آٹا، کسی میں چو ہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلا لے، جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھا رکھا ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے۔ غرضیکہ سب کام ہو چکا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے تو کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھانا کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے کبھی چرخا

کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے شام کو بھٹی چڑھاتا ہے، دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے، گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے آئی، اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔ جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انھیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پٹڑے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کیے۔ اب دھوبن گانا گائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھیے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آجائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے جاسکتے۔ میاں دھوبی! تمھارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھراتے ہو۔ ☆☆☆

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمۂ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں،

جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انھیں سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پُرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی نہیں، ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل کوّے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے "اندر آ جاؤ۔" ہم نے کہا "نہیں آتے۔ تم باہر آؤ۔" خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے "بیٹھ جاؤ۔" ہم نے کہا "بیٹھیں گے نہیں۔" آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے "کیوں بھئی! خیر باشد!" میں نے کہا

"کچھ نہیں۔" کہنے لگے "اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا، اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

"مرزا! بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یوں ہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا "چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات کی جھلک نظر آتی رہتی ہے، یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے سو کر اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے

تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہار ہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُر اسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری......" اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کی اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے، اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی "تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں۔" میں نے کہا "اور کیا؟"

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے۔ یعنی اب بیشک دوست آئیں، بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک گاؤں، بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی "خط ضرور لکھتے رہیے۔" میں نے کہا "ہر روز۔ اور تم بھی۔"

"کھانا وقت پہ کھا لیا کیجیے اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں۔ اب جہاں چاہوں جاؤں، چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ کے لیے رکھا جاتا ہے تو وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگا لیا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو، حجام کو جا کر کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے۔ سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھے بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام و نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور! آپ تو جانتے ہی ہیں اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں

آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے ''تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو، تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی نمٹا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟''

میں نے کہا ''تھیٹر۔''

کہنے لگے ''بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔''

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی، جمائی پہ جمائی حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیا لیکن اس سے بھی تھک گیا۔ پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔ بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا ''ابے یار! اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔''

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر

طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور! حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا ہے کہ بستر پر لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سُرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا، باہر نکلا، اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ "میں بہت اداس ہوں۔ تم فوراً آجاؤ۔"

تار دینے کے بعد دل کو اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔

وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمھاری خیر نہیں اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے، قواعد وضوابط کے مطابق اور متانت وسنجیدگی کے ساتھ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے، کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہو گیا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے، دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جائے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ! وا کیا بات کہی ہے۔" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آ جائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں، سلطنتوں کے۔"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے ''ننگے پاؤں بھاگتا ہوا جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔''، کوئی کہے ''نہیں حضور! سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔'' دوسرے نے کہا ''نہیں صاحب! ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔'' آخر میں بادشاہ سلامت بولے ''ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔'' سب نے کہا ''کیا دماغ پایا ہے حضور نے! کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ وا''

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا ''تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔'' نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ ''تم فوراً آجاؤ۔ میں بہت اداس ہوں'' اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی

کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور پھر ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے کمرے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔ روح منجمد ہوگئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی...... بس میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان ہی گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود از حد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کرسکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کردیا ہے۔ اس لیے میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے، اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں۔"

"دے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھیے تو سہی!

☆☆☆

مرید پور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا، اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے وہاں کہیں ملازم تھا، غبن کا الزام لگا، ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں لیکن

ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک بس علم وفن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلا سے اعلا خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں نے شایستہ سے شایستہ وِدّوانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی بابانگِ دُہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوا لیا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویّہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا، چنانچہ میں نے

شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا، رات کو گھر آ کر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

بعد کے اوقات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے، بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے، پھر دوستوں کو سناتے، پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی اڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام ''مرید پور گزٹ'' ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ یہ دو مہینے تک جاری رہا، پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اڈیٹر صاحب کا حلیہ حسبِ ذیل ہے۔ رنگ گندمی گفتگو فلسفیانہ شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتا معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمے دار نہ ہو گی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بَل پر اپنا ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا، جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکان پر نظر آتے ہیں۔ بہر حال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیتِ انشا پردازی، صحیح الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری

اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھ کو مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہموطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کیے بازار میں سے گزر جاتا ہے، مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی بر سبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی لیکن بہر حال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے۔ جس کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانانِ ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ ''آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ ومہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لیے بیتاب ہیں۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی از حد ضرورت ہے، لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ

ہے کیونکہ خارِ وطن از سنبل وریحاں خوشتر......اسی طرح کی تین چار براہینِ قاطع کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔"

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگان مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحے ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہلِ وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بچاروں کی بہبودی اور رہنمائی کا ذمے دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزار ہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اٹھ کہ سیکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لیے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے اپنے کام میں معروف رہے۔ ہندستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں۔"

''ہندستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔''

''جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا، وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا، تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔''

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں سنا ہے کہ ''دو بیل رہتے تھے ایک جا'' والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ

''پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلمبند کیے تھے، اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کے یہ المناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندستان کی یہ حالت ہے...........وغیرہ وغیرہ۔"

اس کے بعد سوچا کہ ہندستان کی حالت کا ایک دردناک نقشا کھینچوں گا۔ افلاس، غربت، بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں مثلاً غیر ملکی حکومت، آب و ہوا، مغربی تہذیب، لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصلی وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا۔

آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنالیا اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا:

۱۔ تمہید: اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)

۲۔ ہندستان کی موجودہ حالت

الف) افلاس

ب) بغض

ج) قومی رہنماؤں کی خودغرضی

۳۔ اس کی وجہ

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں

کیا آب وہوا ہے؟ نہیں

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرینِ جلسہ پر ایک نظر ڈالو)

۴۔ پھر بتاؤ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ (نعروں کے لیے وقفہ) اس کا نقشا کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ)

۵۔ خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا

رہا۔ سیج کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہوکر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران آواز سب طرف پہنچ سکے اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانانِ ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہار پہنائے اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے انھوں نے کہا "سر باہر نکالیے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر میں مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھے ہزار تک پہنچ چکا تھا جو ایک آواز ہوکر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے مثلاً "ہندستان کی نجات تمھیں سے ہے۔"، "مرید پور کے فرزند خوش آمدید"، "ہندستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ

مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی۔

"حضرات! ہندستان کے جس نامی اور بلند لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے............"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو، ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے:

"مرید پور کا شہر ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوعِ انسان کے لیے............"

خدایا! اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندستان کی حالت کا نقشا کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ غیر موزوں ہوگا۔ جاہل کہنا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں، غیر مہذب۔

"......ان کی اعلا سیاست دانی، ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی

سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے..........''

ہاں وہ تقریر کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر، چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے......''

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔ مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بے ہوشی سے ذرا ہی ورے تھا اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی ''بگلے اور لومڑی کی کہانی'' نہیں ٹھیک ہے دو بیل......''

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور

مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ کہا کہ

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیے۔ میں نے گلے کو صاف کیا تو کچھ اور لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا:

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا اور پھر کہا کہ

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندستان کی آب و ہوا خراب ہے یعنی ایسی ہے کہ ہندستان میں بہت سے نقص ہیں...... سمجھے آپ؟ (وقفہ) نقص ہیں، لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو یہ بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے۔ جو باوجود آب وہوا اور غیر ملکی حکومت کے" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے۔ لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں افلاس بہت ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ غریب ہیں اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھر یعنی آپ دیکھیے تا کہ اگر"

(بلند اور طویل قہقہہ)

"حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔" (قہقہے اور شور غوغا..... اسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے۔)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومے یکے بیدانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے؟) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے دل پکار میں چلاؤں ہائے گل

اس شعر نے دورانِ خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا:

''جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں اور ان کی حکومتیں چار دانگِ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے......''

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا، ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد اسٹیج پر آ گریں لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

''حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے۔''

''تم دو بیل ہو......''

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رُخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مُڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سیدھا اسٹیشن کا رُخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھُس گیا۔ ایک لمحے کے بعد ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

☆☆☆

انجام بخیر

منظر: ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔ زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں تک کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر، ٹالسٹائے، ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیرِ ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔ باہر کہیں پاس ہی کتے بھوک رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گذشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں چہرے سے ذہانت پسینا بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری

تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔
تین طالب علم نہایت اعلا لباس زیب تن کیے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آیئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے لیکن جاہ وحشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو! اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کرلو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چُن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کمرے میں ایک پُراسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے! اے ہمارے محترم استاد ہم تمھارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس: کہو اے ہندستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم: اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم: اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: یہ نہ کہو! یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا اس کا معاوضہ مجھے اسی وقت وصول ہوگیا جب میں نے تمھاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمھارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: (سروقد اور دست بستہ کھڑا ہوکر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمایش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہوگیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کرسکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں اسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: تمھارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہوگئی ہے۔ (پہلے طالب علم کا اشارہ پاکر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ باہر

بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے۔)

پہلا طالب علم (آگے بڑھ کر: اے ہمارے مہربان! مجھ حقیر کی نذر قبول کر۔
(بڑے ادب واحترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے۔)

دوسرا طالب علم (آگے بڑھ کر): اے فرشتے! میرے ہدیے کو شرف قبولیت
بخش۔(اٹھنی پیش کرتا ہے۔)

تیسرا طالب علم (آگے بڑھ کر): اے نیک انسان! مجھ ناچیز انسان کو مفتخر فرما۔
(اٹھنی پیش کرتا ہے۔)

پطرس (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے): ''اے میرے فرزندو،
خداوند کی رحمت تم پر ہو۔ تمھاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے
میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمھیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں
نجات نصیب ہو اور خدا تمھارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے۔
(تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے۔)

طالب علم (تینوں مل کر): اللہ کے برگزیدہ بندے! ہم فرض سے سبکدوش
ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین
ہمارے لیے بیتاب ہوں گے۔

پطرس: خدا تمھارا حامی و ناصر ہو اور تمھاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔
(طالب علم چلے جاتے ہیں)

پطرس (تنہائی میں سر بسجود ہو کر): باری تعالیٰ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے
مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لیے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔

تیرے رحمت کی کوئی انتہا نہیں لیکن ہماری کم مائیگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پُر اسراری روشنی چھا جاتی ہے)

اور فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے۔)

پطرس: اے خدا کے دیانتدار اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو۔

ملازم: (باہر سے): اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سایے پہلے سے دگنے لمبے ہو گئے ہیں۔)

پطرس: آہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر بسجود گر پڑتا ہے۔)

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے۔)

پطرس: آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کی لالچ

سے پاک رکھیو۔

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس: اے مزدور پیشہ انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ ضیاء علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی کے ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس: خدایا! تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ اور ادنا طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ۔

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے سے کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے...........

ایک طویل وقفہ جس کے دوران درختوں کے سایے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ بینڈ بدستور بج رہا ہے۔ یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)

پطرس (کام پر سے سر اٹھا کر): اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز: (باہر سے) حضور! میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں اور عرضِ حال کروں۔

پطرس: (دل میں) میں اس آواز سے ناآشنا ہوں لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شایستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے؟ (بلند آواز سے) اندر آجایئے۔

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے لیکن نظریں زمیں دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔)

پطرس: آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے محترم اجنبی! اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کرلو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چُن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

اجنبی: اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: تمھیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلا ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل

کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کردو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس: اے خدا کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی: مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمھاری خدمت میں کھڑا ہوں اور تمھاری آنکھیں تمھیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہی ہیں۔ اے شریف اور غم زدہ انسان! یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کرلو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی بہت زور سے چیختا ہے۔)

پطرس: ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آ گیا لیکن حضور والا! آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لیے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گذشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے اگر آپ منظور کرلیں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب

انسان سمجھوں۔

پطرس: آپ فرمایئے! میں سن رہا ہوں۔ گو مجھے یقین نہیں کہ یہ عالمِ بیداری ہے۔
(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھے خدّام چھے بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجالا کر باہر چلے جاتے ہیں)

اجنبی: (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ معظم، شہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف ان چاروں کے ایما پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدر دانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس: (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا، اشرفیاں، جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا۔ (آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا ہے)

اجنبی: ان کو قبول کیجیے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجیے۔ (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔)
گاتا: آج موری انکھیاں پل نہ لاگیں

پطرس: اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں؟ اور تو گا کیوں رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کہ ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں

چار پانچ سوروحوں کو خوابِ جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی: (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس: خدا تمھارا حامی و ناصر ہو اور تمھارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے۔)

☆☆☆

سنیما کا عشق

''سنیما کا عشق'' عنوان تو عجب ہوس خیز ہے لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں یا سنیما کی موسیقی اور تاریکی میں جو رومان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سنیما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا موردِ عتاب رہ چکا ہوں، لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سنیما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رَگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں، بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سنیما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما جانے کا ارادہ ہو، ہفتہ بھر پہلے سے انھیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا! میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کوئی ہرج واقع نہ ہو لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں:

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمھارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا!"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں:

"کیوں بھئی! سینما آج کل چھے بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں:

"بھئی! یہ ہمیں معلوم نہیں۔"

"میرا خیال ہے چھے ہی بجے شروع ہوتا ہے۔"

"اب تمھارے خیال کی تو کوئی سند نہیں۔"

''نہیں مجھے یقین ہے۔ چھے بجے شروع ہوتا ہے۔''

''تمھیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟''

اس کے بعد آپ ہی کہیے میں کیا بولوں؟

خیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انھیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں، ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آکر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگا لیتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آجاتی ہے۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدِنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:

''کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟''

''ہاں اندر ہی تھا۔''

''میری آواز آپ نے نہیں سنی؟''

''اچھا یہ تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے۔''

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:

''تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟''

''وہ کہاں؟''

''ارے بندۂ خدا، آج سینما نہیں جانا؟''

''ہاں سینما۔ سینما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے۔ سینما، میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا، ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔''

''تو چلو پھر اب چلیں؟''

''ہاں وہ تو چلیں گے ہی۔ میں سوچ رہا تھا آج ذرا کپڑے بدل لیتے خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں۔ یار ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔''

اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پہ مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

''مرزا! بھئی للّٰہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا

انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہو۔ پونے چھے بج چکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔''

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمھاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔ مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انھیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آجاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہوتے ہیں۔

''ارے بھی چلو۔''

''چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟''

''اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟''

''پان کے لیے ذرا تمبا کو لے رہا تھا۔''

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تگنی رفتا ر سے ہوں لیکن پہنچتا ان کے

ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھُپ۔ بہترا آنکھیں جھپکتا ہوں، کچھ بھائی نہیں دیتا۔ اِدھر سے کوئی آواز دیتا ہے، "یہ دروازہ بند کر دو جی۔" یا اللہ اب جاؤں کہاں؟ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر اِن بالٹیوں سے جاٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رُخ کرتا ہوں اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا کر، آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو۔" خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروایا نا۔ گدھا کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کون سی ہے؟ اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغلگیر نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے، تو معاملہ کھلے، کہ اتنے دیر میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک

وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران میں کم از کم دو تین سوفٹ فلم گزر جاتی ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھے رہتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں کہ جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا، تو محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دائیں طرف سے ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک دو لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں، وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا! دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے؟

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے "یار! تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور قتل عمد، خودکشی، زہر خورانی۔ وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت

مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آجاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرّے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہر حال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں؟ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی مرزا! اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟''

☆☆☆

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے اس لیے اکثر لکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا، میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف ''دریافت'' کرتا تو دوسرے کو ضرور آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یکجہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسیوں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنفِ ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا، جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد

ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا، کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتہ بھر کے بعد انھیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی، کہ میں انھیں پڑھ چکی ہوں۔ تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اول تو میرے لیے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا، لیکن فرض کیجیے مردوں کی لاج رکھنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لیے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جاں فشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی، میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھویں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لیے دروازہ کھولتا یا اس کے

سگریٹ کے لیے دیا سلائی جلاتا یا اپنی سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لیے خالی کر دیتا تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھیے لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہیں پڑھی تھیں ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدّت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا:

''ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دورِ جدید کا نقطہ نظر کچھ نبھ نہ سکا لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں۔ بری نہیں بری نہیں۔''

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا:

''ہاں پڑھا تو ہے لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے، وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں؟ تمھارا کیا

خیال ہے؟''

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:

''اس نقاد پر اٹھارہویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن یوں ہی نامعمول سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔''

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میبل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتے میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی۔ اب میں اس کے لیے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لیے مجھ پر دہری دہری لعنتیں بھیجیں گی، کہ ایک تو

میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلی کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کہ کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی علمیت جتاتا رہتا ہوں۔ میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے۔ میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا، لیکن حقیقت تو یہی ہے نا کہ میں وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا اور اپنا آپ عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ مہلک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا۔ تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی، دوا پلائی، ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا، (میری آواز بھرّائی ہوئی تھی) ''میبل! مجھے خدا کے لیے معاف کردو۔'' اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کردی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا ''میبل! پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔''

کہنے لگی: ''نہیں تو۔''

میں نے کہا: ''مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بک رہا تھا وہ سب من گھڑت تھا۔''

کہنے لگی: ''کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔''

میں نے کہا: ''پلاٹ کے متعلق میں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ کیا یہ بھی ٹھیک تھا؟''

کہنے لگی: ''ہاں۔ پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔''

اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی: ''تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟''

میں نے کہا: ''ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا لیکن اب میں انھیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا

ہوں۔ انھیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انھیں پڑھ چکی ہو۔"
کہنے لگی: "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے بھی ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انھیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

☆☆☆

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا:

"مرزا! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے: "بھئی، کچھ ہوگا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا، "میں بتاؤں تمھیں؟"

کہنے لگے، "بولو۔"

میں نے کہا، "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا۔ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں...... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہہ دو گے حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دُم ہوتی ہے، تمھاری دُم نہیں، لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں کہ وہ بھی پیدل چلتے ہیں میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے، ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے

دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے وفائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ ہی نہیں، یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پچی کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا:

"مرزا! میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے؟ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیے

تا کہ تمھیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے"ہوں۔"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھالیں۔ سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے"ہوں۔"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے، تا کہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے لیکن مرزا نے پھر کہا"ہوں۔"

میں نے کہا"مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمھیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمھارا کلام"ہوں"سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمھاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے"نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں، تو میاں صاحبزادے! خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا
''میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں۔''

مرزا بولے ''کون کون سی مثلاً؟''

میں نے کہا ''ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔''

مرزا نے کہا ''چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپے کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے ''میں تمھیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔''

میں نے کہا ''وہ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔''

کہنے لگے ''مفت۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا ''مفت؟ وہ کیسے؟''

کہنے لگے ''مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم ہی احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔''

ایسے موقعے پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ

کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھٹنوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے تم لے لو۔"

میں نے کہا "پھر کہنا پھر کہنا!"

کہنے لگے "بھئی! ایک بائیسکل میرے پاس ہے۔ جب میری ہے تو تمھاری ہے۔ تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینا پسینا ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے؟ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں؟

میں نے کہا "مرزا سب سے پہلے تو اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمھارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمھارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو از حد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ مرزا صاحب کہنے لگے:

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا، "مرزا! مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

مرزا کہنے لگے، "بس میں اسی بات سے ڈرتا تھا۔ تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا، "خیر کچھ بھی سہی۔ تم سچ سچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے، "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا، "تم نے کتنے کی خریدی تھی؟"

کہنے لگے، "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا، "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے، "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے

کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنھیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا! پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے؟ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے، "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا۔ لیکن..........."

میں نے کہا، "نہ مرزا! قیمت تو تمھیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو میں تمھاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمھیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا، ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر تم سے سودا چکاؤں، یہ تو کچھ دکان داروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمھاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں؟ آخر بائیسکل ہے، ایک سواری ہے۔ فٹنوں و گھوڑوں موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔

چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو نہیں ہو سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا، ''مرزا! اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمھیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔''

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ ''مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔'' رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا ''کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ کر دینا...... خدا حافظ...... اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا...... خدا حافظ اور تمھارا بہت بہت شکریہ۔ میں تمھارا بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو نا کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں...... کل صبح آٹھ نو بجے تک...... ضرور...... خدا حافظ۔''

مرزا کہنے لگے ''ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا، ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔''

میں نے کہا ''ہاں ہاں۔ وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل بھیج ضرور دینا اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا...... خدا حافظ۔''

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کرلیا کہ دو تین دن کے اندر اندر ارد گرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہوسکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضا مند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوش خبری سنائی کہ "حضور! وہ بائیسکل آگئی ہے۔"

میں نے کہا "اتنی سویرے؟"

نوکر نے کہا "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی یہ ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لیے تھے تو بائیسکل کیوں روک لیتے۔

نوکر سے کہا، "دیکھو، یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو، بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے، اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو...... ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کُپّی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکل والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پُرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پُرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا۔ بائیسکل کا پالش گِھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ 'چل چل چنبیلی باغ میں' گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح سے پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے؟ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے! یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا، ''حضور! یہ بائیسکل ہے۔''

میں نے کہا، ''بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟''

کہنے لگا، ''مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لیے۔''

میں نے کہا، ''اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟''

کہنے لگا، ''یہی تو ہے۔''

میں نے کہا، ''کیا بکتا ہے؟ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟''

کہنے لگا، ''جی ہاں۔''

میں نے کہا، ''اچھا۔'' اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

''اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟''

''حضور! دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔''

''تو یہ میلی کیوں ہے؟''

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

''اور تیل لایا؟''

''ہاں حضور لایا ہوں۔''

''دیا؟''

''حضور! وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں وہ نہیں ملتے۔''

''کیا وجہ؟''

''حضور! دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔''

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پُرزوں پر غور کیا تو اتنا تو ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمدورفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا، ''حضور! وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔''

میں نے کہا، ''اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔''

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا، تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں، چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ، کھڑکھڑ، کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چرچرخ، چرچرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی

جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیا گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیّوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کرنے کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو، تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیّے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیا ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکّے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ...... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آ گیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے، بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا، کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیّوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس

میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھے انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کررہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹھکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہو جانا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کرلوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرالیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے باہر نکل کر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو نکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے

لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدّی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا، ''دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟'' گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدّی کو اونچا کیا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدّی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدّی سے قدرے اوپر ہی رکھتا لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اُٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی، تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے دکان میں جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا:

''ذرا اس کی مرمت کر دیجیے۔''

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی۔ جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔

معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کردو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کردوں؟"

میں نے کہا "ہاں وہ بھی ٹھیک کردو۔"

کہنے لگا "اگر آپ باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا "اچھا کردو۔"

بولا "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا، "بس جی، جو کام تم سے کہا ہے کردو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہیں بدتمیز کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے۔"

بولا ''جناب! آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہوگی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ للو! یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں، لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔''

میں نے کہا ''واہ! مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے تو ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔''

مستری نے کہا ''ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔''

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے، اس لیے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوئی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغا بازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے

پونے داموں میں بیچ کو جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دکان آئی۔ وہاں ٹھہر گیا۔

دکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقعے پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ ''یہ بائیسکل ہے۔''

دکان دار نے کہا، ''پھر؟''

میں نے کہا، ''لو گے؟''

کہنے لگا، ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا، ''بیچتے ہیں ہم۔''

دکان دار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے؟ آخر کار بولا،

''کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟''

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے؟ میں نے کہا، ''کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا؟''

کہنے لگا ''وہ تو ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟''

میں نے کہا" اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا" اچھا چڑھ گیا، پھر؟"

میں نے کہا" پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دکان دار بولا" اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہوں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا، میرے پاس آئے اور کہنے لگے،" تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا" تو اور کیا، محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا" تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا" تمھیں بتاؤ۔"

کہنے لگا" سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا" ہاں۔"

کہنے لگا" سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا" اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا" تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے

کانپنے لگے۔ میں نے کہا:

''او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان!
مجھے اپنی توہین کی پرواہ نہیں لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کرسکتا۔'' یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور اِدھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدّت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت وشنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد وپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیا بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی بائیسکل میرے پاس ہی پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیا الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا

کہ یہ تم کیا کررہے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟ تمھارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیّے کاہے کو لے جارہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انھیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشایستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی ''بس حضرت! غصہ تھوک ڈالیے۔'' ایک دوسرے صاحب بولے، ''بے حیا بائیسکل! گھر پہنچ کر تجھے مزا چکھاؤں گا۔'' ایک والد اپنے لختِ جگر کی انگلی پکڑے جارہے تھے۔ میری طرف اشارہ کرکے کہنے لگے ''دیکھو بیٹا! یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔''

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پُل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیّوں کو ایک ایک کرکے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔۔ مرزا بولے،

''اندر آ جاؤ۔''

میں نے کہا، '' آپ ذرا باہر تشریف لایئے۔ میں آپ جیسے خدارسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟''

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا،

''مرزا صاحب! آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف، اے میں پڑھی تھی۔

☆☆☆

لاہور کا جغرافیہ

تمہید

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کُرے کو دائیں سے بائیں گھمایئے۔ حتیٰ کہ ہندستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں یہ نام کُرے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں

اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پُل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں، لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے او۔ دوسرا دہلی سے۔ وسطِ ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یو۔ پی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا، لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دار الخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے، جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں، بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کی پیشِ نظر اہلِ شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں، بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کے بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکّبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آرہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی

ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہے۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے، لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تاکہ وہ

یہاں کی سیاحت سے کماحقہ اثر پزیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں، جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو بنک لگا کر ان میں ایک گھوڑا اٹا نک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انھیں کا گوشت بکتا ہے۔ اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کے بجائے بنا سپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بنا سپتی گھوڑا شکل وصورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر

قابلِ دید مقامات

لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں مثلاً ''اہلِ لاہور کو مژدہ'' یا ''اچھا اور سستا مال'' اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں، مثلاً ''گریجویٹ درزی ہاؤس'' یا ''اسٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع'' یا ''کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا'' رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتا مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمنِ خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کی فلم کے محاسن گلوار کھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحظہ

بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں، یہ دقت بہت حد تک رفع ہوگئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹنے تک وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی ''محمد علی دندان ساز'' لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے جہاں ''بجلی پانی بھاپ کا بڑا اسپتال'' لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ ''خالص گھی کی مٹھائی'' امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے، ''کرشنا بیوٹی کریم'' شالامار باغ کو اور ''کھانسی کا مجرب نسخہ'' جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف اڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں، اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے، سہ پہر کو کسی سنیما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں، بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سنیما یا سنیما کے گرد نواح میں۔

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لیے ہندستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خُم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبہ کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر با آوازِ بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیاتِ جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے، اسے آخر تک ملوّث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لیے محدّب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ

لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی اتا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آیندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات:

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمھیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

☆......☆......☆